© rasailojaraid.com

مطبوعات

مولانا عبید اللہ سندھی:۔ تالیف پروفیسر محمد سرور صاحب۔ مجلد۔ ضخامت ۳۸۴ صفحات۔ قیمت للعہ۔ سندھ ساگر اکیڈمی، چیمبرلین روڈ، لاہور۔

مولانا سندھی مرحوم، جن کی وفات زمانۂ حال کا ایک قومی سانحہ ہے، ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے مقصد و تخیل کے پیچھے اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بھی ان کے احترام پر مجبور ہیں جو ان کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ لیکن مولانا مرحوم اپنے خیالات کو عمل میں لانے کا جتنا زبردست جوش و ولولہ رکھتے تھے، اُنھیں سمجھانے کی اتنی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اُن کا تخیل ایک شارح کا محتاج تھا جو ان کی بات کو سمجھ کر دوسروں کو اچھی طرح سمجھائے۔ یہی خدمت ان کے لائق شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب نے انجام دی ہے۔ خود مولانا سندھی مرحوم بھی اپنی زندگی میں اس کی توثیق فرما چکے ہیں کہ یہ ان کے مافی الضمیر کی اچھی ترجمانی ہے، لہٰذا یہ کتاب اس لحاظ سے، اور صرف اسی لحاظ سے خیر مقدم کی مستحق ہے کہ یہ قریبی عہد کے ایک ایسے صاحبِ فکر کی واضح ترجمانی کرتی ہے جو خود اپنے آپ کو اچھی طرح نہ سمجھا سکا تھا۔

لائق مولف نے اس کتاب میں مولانا مرحوم کے حالاتِ زندگی سے بہت کم تعرض کیا ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر مرحوم کے خیالات ہی کی طرف منعطف رہی ہے اور اس سلسلہ میں ان کا دائرۂ بیان بہت وسعت اختیار کر گیا ہے، حتیٰ کہ فلسفہ، مذہب، اخلاق، تصوف، تاریخ، اور سیاسیات کے بکثرت مسائل اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ ایسی ایک وسیع المبحث کتاب، خصوصاً جبکہ وہ اپنے نقطۂ نظر میں کافی غرابت بھی رکھتی ہو، ایک مختصر تبصرے میں تنقید کا حق پوری طرح نہیں پا سکتی۔ مجملاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذکورۂ بالا مسائل کے بارے میں جو طرزِ فکر اس کے اندر پایا جاتا ہے وہ ہندوستان میں کوئی نیا طرزِ فکر نہیں ہے بلکہ نانک، کبیر، اکبر، داراشکوہ اور رام موہن رائے وغیرہم کے ذریعہ سے پہلے بھی ہندوستان اس سے آشنا ہوتا رہا ہے۔ فرق اگر ہے تو روح میں نہیں بلکہ موادِ بحث، طریقِ استدلال اور تفصیلات میں ہے، اور سب سے بڑھ کر اس امر میں ہے کہ اس طرزِ فکر کو اسلام اور اصلی اسلام کا جامہ پہنا کر پیش کرنے کی اتنی بے باکانہ کوشش اس سے پہلے نہیں کی گئی تھی

ہمارا کام بھی نسبتاً بہت ہلکا اور کم ناخوشگوار ہو جاتا اگر ان خیالات کو محض ایک فکرِ آزاد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہوتا۔ لیکن چونکہ انھیں فکرِ اسلامی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور بتکرار ان دعووں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اصل دین یہ ہے نہ کہ وہ جو مولانا سندھی سے اختلاف رکھنے والے سمجھے ہیں، اس لیے ہم اس دلی تکلیف کے ساتھ جو مولانا مرحوم کے ہر مخلص نیازمند کو ان کی وفات کے اس قدر قریب زمانہ میں ان کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے محسوس ہونی چاہیے، بعض ایسے بنیادی امور کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جو اس مجموعۂ افکار میں اسلامی طرزِ فکر سے صریحاً متصادم نظر آتے ہیں۔

"تمام مذاہب کی تعلیمات کو الگ رکھ کر تاریخِ انسانیت کا مطالعہ کرو تو اصول ارتقا اور اصول نہ دل مل جائیں گے"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر یہ سچ ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر سلسلۂ نبوت و وحی کی کیا ضرورت ہے؟ ہم تاریخ انسانیت کے مطالعہ سے خود اپنے لیے حسب ضرورت قانونِ ارتقا مستنبط کر سکتے ہیں۔ دنیا کا ہر نظام پچھلے تجربات سے استفادہ کرکے ہی بنتا ہے۔ پھر آخر پیغمبر کس لیے آتے رہے؟ منکرین ہی اس کام کے لیے کافی تھے۔ دراصل اس نظریہ میں ایک غلط فہمی چھپی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانیت کے تجربات ہماری رہنمائی کرتے ہیں مگر ان سے ترقی و تنزل کے قوانین اخذ کرنے اور واقعات کے اسباب و علل تلاش کرنے کے لیے جس ہمہ بین نظر اور جس بے لاگ تفکر کی ضرورت ہے وہ کسے حاصل ہے؟ کون ایسا انسان ہے جو تمدن کی مشینری کے پیچیدہ اجزا کے علل و تعامل کو بہمہ وجوہ سمجھتا بھی ہو اور پھر ان سے نوامیس عاملہ کو تلاش کرتے وقت خواہشات، جذبات اور تعصبات سے اپنے ذہن کو یکسر خالی بھی کر سکے۔ انسان کی یہی کمزوری نبوت کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اگرچہ نبی جو قانونِ اخلاق اور نوامیس حیاتِ اجتماعیہ پیش کرتا ہے ان کے لیے وہ بھی استشہاد تاریخ انسانیت ہی سے کرتا ہے، مگر اس کی آنکھ جہالت اور خواہش اور تعصب کے شیشوں سے ڈھکی ہوئی نہیں ہوتی۔

"مولانا کا یہ عقیدہ ہے کہ زمانہ کا تقاضا خدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے اور زندگی کے اسباب و حالات جس نظام کے متقاضی ہوتے ہیں، خدائی مصلحت اسی نظام کو دنیا میں نافذ کرنا چاہتی ہے۔"

یہاں قضائے الٰہی اور رضائے الٰہی کے فرق کو نظر انداز کرکے ایک ایسی عظیم الشان بنیادی غلطی کی گئی ہے جسے اگر اس کے منطقی نتائج تک پہنچا دیا جائے تو ضلالت و ہدایت، فسق اور طاعت، اصلاح اور فساد سب یکساں حق ٹھیرتے ہیں، بلکہ حق اور باطل کا امتیاز ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ اقتضائے زمانہ سے جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ مشیت یا قضائے الٰہی کے تحت ہی رونما ہوتا ہے، مگر حق پر یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا کہ جو کچھ زمانے کے تقاضے سے رونما ہوا سے حق کہہ دیا جائے۔ "زمانہ کا تقاضا" ہی اگر تعمیر مستقبل کے لیے محرک اور اساس ہو تو پھر "افق کے اس طرف سے" کسی جداگانہ فوق الفطری تحریک اصلاح و انقلاب اور تعلیم حق کے آنے کی کیا حاجت باقی رہ جاتی ہے؟ زمانہ کا تقاضا تو قوموں کو ہر راہ پر چلاتا ہے چاہے وہ راہ عیاشی کی ہو، سرمایہ پرستی کی ہو، الحاد کی ہو، یا ظلم کی، اور پھر قومیں جس راہ پر بھی جانا چاہتی ہیں قضائے الٰہی ان کے حق میں اسی کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ مگر اس سے بڑی کوئی گمراہی نہیں ہو سکتی کہ اس قضاء کو حجت قرار دے کر ایسی سب راہوں کو صراطِ مستقیم سمجھ لیا جائے۔

"تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے وہ وجود ہے ...... اس وجود سے جو مراد نہیں، بلکہ وہ حقیقت مراد ہے جس کی بنا پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بلا کسی موجود کرنے والے کے موجود ہے ... اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں، وہ اعتباری ہیں، اس لیے اگر وجود نہ ہو تو ان سب کا خاتمہ ہے۔ لہٰذا یہی وجود خدا تعالیٰ کا عین ذات ہے اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے۔" (بحوالہ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی)

یہاں اس عقیدہ کی عقلی اور نقلی غلطیوں پر بحث کرنے کا موقع نہیں، مختصر یہ ہے کہ یہ ایک شدید ترین گمراہی کا فلسفہ ہے جسے صوفیوں کے ایک گروہ سے سندِ حقانیت مل جانے کے باعث تقدس کا مقام حاصل ہو گیا۔ اس کی جو تقریر مصنف نے شاہ محمد حسین صاحب کے حوالہ سے نقل فرمائی ہے اس کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ نکلیں گے کہ تمام موجودات کے اندر خدا خود کام کر رہا ہے، اور جب یہ بات ہے تو پھر دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے صحیح ہو رہا ہے، غلطی کا اس میں کچھ کام نہیں۔ یہی عقیدہ اقتضائے زمانہ (تاریخ) کو "ارادۂ ربانی" بنا دیتا ہے اور پھر انسان کو اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ رفتارِ زمانہ پر یہ سمجھتے ہوئے بہتا چلا جائے کہ یہ سب کچھ منشائے الٰہی ہے۔ اسی عقیدے سے ہیگل کا تصورِ تاریخ پیدا ہوا ہے جس کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدعا یہ ہے کہ اعتباری تشخصات وتعینات کے اندر جو جوہر اصلی کام کر رہا ہے وہ ہر جگہ ایک ہی ہے اور وہ دو متضاد طاقتوں کا روپ دھار کر کے تصادم در تصادم کا معرکہ چھیڑے ہوئے ہے تاکہ اپنی تکمیلی منزل کو پہنچ سکے۔ تاریخ کا یہ باطل تصور منجملہ اور بہت سے غلط نتائج کے، ہم کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ نوع انسانی اضطراراً سیدھی ارتقار کی راہ پر بڑھی چلی جارہی ہے۔ حالانکہ اسلام کا دعوٰی یہ ہے کہ انسان جب انبیار کی ہدایت کو مان لیتا ہے تو تاریخ ارتقا کرتی ہے اور جب وہ اس ہدایت سے روگردانی کر لیتا ہے تو تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

"تمام انسانوں میں ایک وحدت فکری ہے اور ان میں یہی ایک نقطۂ اشتراک ہے اور اسی سے ادیان اجتماع اور اقوام کے اختلافات کم ہو جاتے ہیں۔ نیز قرآن اور دوسری الٰہی کتابیں اسی وحدت فکری کی ترجمانیں"

یہ وحدتِ ادیان کے اس تصور کی ایک ذرا سی جھلک ہے جسے مصنف نے مولانا مرحوم کی ترجمانی کرتے ہوئے کافی شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اول تو یہ تصور وحدۃ الوجود کے اس فلسفے کا قدرتی اقتضاء ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، مزید براں مولانا مرحوم نے جس طرح پر نیشنلزم اور بین الاقوامیت کو یکجا جمع کیا تھا اس کا بھی یہ لازمی تقاضا تھا کہ ایک طرف تو وہ بین الاقوامیت کی خاطر (اور ہندوستانی نیشنلزم کی خاطر بھی) وحدتِ ادیان کا ایک فلسفہ وضع کرتے اور دوسری طرف مخصوص مذہبی شرائع اور قوانین اور تہذیبی صورتوں کو قومی خصوصیات قرار دے کر ان کے ترک واختیار کی آزادی تمام قوموں کے لیے ثابت کرتے۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا ہے۔ وہ چند مطلق (بے صورت) صداقتوں کو اصل دین قرار دے کر کہتے ہیں کہ وہ تمام ادیان اور تمام انسانوں میں مشترک ہیں اور قرآن در اصل انھیں کی طرف دعوت دینے آیا ہے، پھر ان شرائع اور سنن کو جو قرآن اور اسوۂ محمدی میں مقرر کی گئی ہیں اور جن پر عہدِ نبوت وخلافت راشدہ میں مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی زندگی کی تشکیل کی گئی تھی محض قومی رسوم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان رسوم کو عالمگیر قانونِ زندگی بنانا مقصود نہ تھا بلکہ دینِ مطلق کے اندر ان رسوم کو قومی حالات وضروریات کے مطابق ڈھالنے اور بدل لینے کی گنجائش ہے۔ مصنف کے الفاظ میں اس کی تقریر ملاحظہ ہو:

ا۔ "جو پانی بہہ جاتا ہے وہ لوٹتا نہیں۔ قرآن پر عمل کر کے خلافتِ راشدہ کے دور میں صحابہ نے جو حکومت بنائی، اب بعینہ ویسی ہی حکومت نہیں بن سکتی۔"

ب۔ "قرآن کی تعلیم کو تیرہ سو برس پہلے ایک زمانہ میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا۔ اب ضروری نہیں کہ دوسرے زمانہ میں وہ پھر بعینہٖ اسی صورت میں ظاہر ہو۔"

ج۔ "اگر صرف پہلے کے بنے ہوئے شرائع وآئین پر ہی سارا انحصار ہے تو پھر قرآن کی اثر آفرینی کا انجام ظاہر ہے۔"

د۔ "اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے اور وہ غیر متبدل ہے گی لیکن جہاں کہیں کسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ قانونِ اساسی تو غیر متبدل ہوتا ہے لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت انہی تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں۔"

س۔ "مولانا کے نزدیک بھی کہیں کہیں جو احکام ہیں وہ در اصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان احکام کو اپنی خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مختصر تبصرے میں زیادہ اقتباسات کی گنجائش نہیں نکل سکتی تاہم ان چند اقتباسات سے مولانا کے خیالات کا بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے ۔ ایک فلسفی ہونے کی حیثیت سے ہر سوچنے والے کو ہر بات سوچنے کا اختیار حاصل ہے ، مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ قرآنی تعلیمات اور سنت محمدی کے ایک حصے کو دائمی اور عالمگیر اور دوسرے حصے کو قومی اور وقتی قرار دینے اور پھر بلا دلیل و سند یہ کہنے کا کسی کو کیا حق ہے کہ دراصل یہی قرآن اور پیغمبر صلعم کا مدعا تھا اس کے بعد مولانا کے تخیل کی آخری منزل ہمارے سامنے آجاتی ہے ۔ شرائع اور سنن کو وقتی اور قومی قرار دینے کے بعد مولانا یہ چاہتے تھے کہ اس دینِ مطلق کو جس کا تصور اوپر بیان ہوا ہے اسے لیا جائے اور اس کے ساتھ قرآنی و محمدی شرائع و سنن کے بجائے ان شرائع و سنن کا جوڑ لگا دیا جائے جو ہم کو یورپ اور اشتراکی روس وغیرہ سے ملتے ہیں ۔ ان کے نزدیک یورپ اور اشتراکی روس کے طریقوں میں اگر کوئی قصور ہے تو صرف یہ کہ ان کے ساتھ دینِ مطلق کا جوڑ لگا ہوا نہیں ہے ۔ اس مضمون کو بھی مصنف نے کافی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ نمونہ کے طور پر صرف چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :۔

> "میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کر لیا جائے یعنی علم اور سائنس کی ترقیوں کو ہم اساس کی حیثیت دیں۔"
>
> "میں مادیین کے تصور کائنات کو سرے سے غلط نہیں مانتا لیکن اسے ناقص ضرور سمجھتا ہوں ۔ مادی فکر کا منکر نہیں ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ مادیت حقیقت کا صرف ایک رُخ ہے اور یہ رُخ بے شک حقیقت کے ایک پہلو کا صحیح ترجمان ہے۔"
>
> "اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت مادی زندگی کی تنظیم کا منتہائے کمال ہے۔"
>
> "نیا روس بالکل لادینی تھا اور مولانا کے دیندار لیکن مولانا کی دینداری نے انقلابیوں کی اس لادینی میں بھی صحیح جذبہ کو سرگرم عمل پایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے کھلے دل سے روسی انقلاب کی ہر اچھی چیز کو سراہا اور انقلاب برپا کرنے والوں کی معجزانہ قوتوں کو تسلیم کیا لیکن اس کے باوجود آپ مسلمان ہی رہے۔"

صاف اور سیدھی زبان میں اگر اسے بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ صرف چند مطلق مذہبی تصورات قرآن سے لے لیے جائیں ۔ اور قرآن ہی سے کیوں ؟ وہ تو تمام مذاہب و ادیان میں ہی مشترک ہیں ! ــــ رہی شریعت اور تہذیب و تمدن و معاشرت کی مخصوص شکل ، تو اس معاملہ میں قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ پیش کیا تھا وہ صرف عرب کی قوم کے لیے تھا ، لہٰذا ہمیں آزادی ہے کہ اسے کلیاً یا جزءً اپنے لیے منسوخ ٹھیرا کر شریعت فرنگ اور سنن روسیہ کو اختیار کر لیں ۔

تخیل کی ان بے پایاں وسعتوں کو لیے ہوئے مولانا جب تاریخ اسلام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو انھیں خلفائے راشدین ، بنو امیہ ، بنو عباس ، اکبر اور اورنگ زیب سب ہی یکساں قابل قدر اور قابل تعریف نظر آتے ہیں کیونکہ مذکورۂ بالا نظریات کو ایک نظام فکر کی شکل میں مرتب کر کے جو شخص بھی دنیا پر نگاہ ڈالے گا اسے باطل تو کہیں نظر آ ہی نہیں سکتا ، تمام مختلف چیزیں خواہ وہ بالکل ایک دوسرے کی ضد ہی کیوں نہ ہوں ، اس کے تخیل کی فضائے مطلق میں حق کی حیثیت سے جگہ پا سکتی ہیں ۔

اگر ہم حسن ظن سے کام لیں ، تو کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم کے نظام فکر کے بیشتر اجزاء ایسے تھے جو ان کا اصل عقیدہ و مسلک نہ تھے بلکہ انھوں نے یہ ایک جدید علم کلام محض اس لیے مرتب کیا تھا کہ ان کے نزدیک موجودہ زمانہ میں دین کی دعوت انہی اصولوں پر پھیلائی جا سکتی تھی ، لیکن اس حسن ظن کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ یہ فلسفہ و کلام قطعی غلط اور سراسر ضلالت ہے اور اگر دین کی دعوت پھیلنے کی بس یہی ایک صورت رہ گئی ہے تو اس طرح اس کے پھیلنے سے نہ پھیلنا ہزار درجہ بہتر ہے ۔ مولانا مرحوم کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کا تعلق علمائے کرام کے اس طبقہ سے تھا جو اپنی گروہ بندی کی عصبیت میں حد کمال پر پہنچا ہوا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا یہ سب کچھ فرما گئے اور لکھوا اور چھپوا بھی گئے اور

© rasailojaraid.com